محمد معز الدین

علامہ اقبالؒ اور عظمتِ انسانی

علامہ اقبال کے فکر و فلسفے اور تصورِ حیات میں انسان کی حیثیت مرکزی ہے۔ عظمتِ انسانی کے متعلق اقبال نے خود فرمایا کہ :

''میں ایک انسان کے شان دار اور درخشاں مستقبل پر پختہ ایمان رکھتا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ انسان نظامِ کائنات میں ایک مستقل عنصر کی حیثیت حاصل کرنے کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہے۔''

خود شناسی سے خدا شناسی کے تمام مراحل میں انسان کی یہی انفرادیت، عظمت اور جوہرِ خدا داد نے اسے اشرف و افضل بنایا، اور سماج میں ارتقا کی تمام منزلوں میں وہ سر برآوردہ رہا ہے۔ علامہ اقبال جب کہتے ہیں کہ :

برتر از گردوں مقامِ آدم است　　اصلِ تہذیب احترامِ آدم است[1]

تو بات صرف انسان کی اپنی ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ یہی تصور پھیل کر نظامِ کائنات میں ایک مستقل عنصر کا سبب بن جاتا ہے، اور تہذیب و تمدن کے سماجی شعور کی دنیا لامحدود ہو جاتی ہے اور وہ معاشرے کا ایسا فرد بن جاتا ہے جو صحیح معنوں میں زمین پر خدا کا نائب ہوتا ہے۔ پروفیسر شیمل (Schimmel) نے *Gabriel's Wings* میں اقبال کے عظمتِ انسانی کے اسی تصور کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ کہتی ہیں :

۱۔ ''جاوید نامہ''، ص ۷۵۔

"His revaluation of man is not that of man *qua* man ; but of man in relation to God."

یعنی اقبال انسان کی قدر و قیمت کا اندازہ محض انسانی رشتے سے نہیں بلکہ انسان اور خدا کے مابین جو تعلق ہے ، اس سے کرتے ہیں ، اور اس طرح ان کی جرأت آموز "تابِ سخن" نے ان سے یہ کہلوایا :

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

اور اقبال پیرِ رومیؒ کے ہم نوا بن کر کہتے ہیں :

شعلۂ در گیر زد بر خس و خاشاکِ من
مرشدِ رومی کہ گفت "منزلِ ما کبریا است"[۲]

"اسرارِ خودی" اور "رموزِ بے خودی" دراصل انسان کی اسی انفرادی اور اجتماعی عظمت کی تشریح و تفسیر ہیں ۔ "اسرارِ خودی" میں فرد کی عظمت اور "رموزِ بے خودی" میں اس کی سماجی حیثیت بیان کی گئی ہے ۔ عظمتِ انسانی کا یہ تصور "اسرار و رموز" تک محدود نہیں بلکہ اُن کی شاعری کے ہر دور میں یہ غالب عنصر رہا ہے ، اور یہی رو جاری و ساری رہی ہے ۔ کہیں دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں دیکھی تو کہیں "آدمیت احترامِ آدمی" کہہ کر انسانی عظمت و احترام کا اعلان کیا ۔ مولانا روم نے آئیڈیل انسان کی وضاحت ان اشعار میں کی ہے :

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر
کز دام و دو ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما
گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

۲۔ "پیامِ مشرق" ، ص ۲۰۴ ۔

[کل شیخ چراغ لے کر شہر میں پھر رہا تھا کہ شیطانوں اور حیوانوں سے آزردہ ہوں ۔ مجھے انسان کی تلاش ہے ۔ میں ان سست عناصر ساتھیوں سے دل گرفتہ ہوں ۔ شیرِ خدا اور رستم دستاں کی آرزو ہے ۔ میں نے کہا کہ بہت ڈھونڈا ایسا کوئی نہیں ملتا ۔ جواب ملا کہ جو نہیں ملتا اسی کی آرزو ہے ۔]

اقبال نے اپنے پیر و مرشد مولانا رومیؒ کے یہ اشعار ''اسرارِ خودی'' کے پہلے صفحہ پر نقل کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ان کو بھی ایسے ہی آئیڈیل انسان کی تلاش ہے جس کا ملنا آسان نہیں ۔ ان اشعار کو انھوں نے ''جاوید نامہ'' میں بھی شامل کر لیا ہے ۔ اقبال کے نظامِ فکر میں بھی انسان کی پیہم تلاش بنیادی حقیقت ہے ؛ ایک ایسے انسان کی تلاش سے دراصل تلاشِ حق کی سعی ہے ، کیونکہ انسان اوصافِ ایزدی سے معمور ہے ۔ وہ خدا کا دستِ راست بن کر کائنات پر حکم رانی کرتا ہے ۔ خیال و عمل اور عقل و وجدان کی مکمل ہم آہنگی کے ساتھ یہ شجرِ انسانیت کا آخری ثمر ہوتا ہے اور وہ ان الفاظ میں اس کے ورودِ مسعود کا انتظار کرتے ہیں :

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا — اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا
رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو — در سوادِ دیدہ ہا آباد شو
شورشِ اقوام را خاموش کن — نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن
خیز و قانونِ اخوت ساز دہ — جامِ صہبائے محبت بازدہ
باز در عالم بیار ایامِ صلح — جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح
نوعِ انسان مزرع و تو حاصلی — کاروانِ زندگی را منزلی[۳]

علامہ اقبال کا تصورِ عشق بھی مولانا رومی کے عشقِ الٰہی کا مماثل بن کر ''تخلقوا باخلاق اللہ'' کا پیکر بن جاتا ہے ، کیونکہ رومی ہی کے روحانی تصورِ عشق نے انھیں عشق و مستی سے ہم کنار کیا ۔

گرہ از کارِ ایں ناکارہ وا کرد — غبارِ رہگذر را کیمیا کرد

۳- ''اسرار و رموز'' ، ص ۵۱ ۔

نے آن نے نوازے پاکبازے مرا با عشق و مستی آشنا کرد[۴]

وہ فرماتے ہیں کہ :

ز رومی گیر اسرار فقیری کہ آن فقر است محسود امیری
حذر زاں فقر و درویشی کہ از وے رسیدی بر مقام سر بزیری[۵]

اور ارتقائے انسان میں عشق ، فقر ، جرأت ، تحمل ، تخلیقی قوتیں تمام ممد و معاون بن کر ایک ایسا مرد کامل پیدا ہوتا ہے جس کی جرأت اس سے یہ کہلوا سکتی ہے کہ :

در دشت جنون من جبریل زبوں صیدے
یزداں بہ کمند آور اے ہمت مردانہ[۶]

علامہ اقبال تلقین کرتے ہیں کہ :

مدہ از دست دامان چنیں مرد کہ دیدم در کمندش مہر و مہ را[۷]

ایسا مرد خود آگاہ نیابت الٰہی حاصل کر کے خدا کا رازداں بن جاتا ہے ۔ اُس کی اپنی رضا مشیت الٰہی بن جاتی ہے اور یہی تصور عظمت انسانی ہے جس نے اقبال سے ایسے شعر کہلوائے کہ :

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے[۸]

عبث ہے شکوۂ تقدیر یزداں
تو خود تقدیر یزداں کیوں نہیں ہے[۹]

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے ![۱۰]

۴۔ ''ارمغان حجاز'' ، ص ۱۰۶ ۔
۵۔ ایضاً ، ص ۱۰۸ ۔ ۶۔ ''پیام مشرق'' ، ص ۱۹۸ ۔
۷۔ ''ارمغان حجاز'' ، ص ۹۵ ۔ ۸۔ ''بال جبریل'' ، ص ۸۱ ۔
۹۔ ''ارمغان حجاز'' ، ص ۲۵۴ ۔ ۱۰۔ ''بال جبریل'' ، ص ۱۴ ۔

وہ بحر ہے آدمی کہ جس کا ہر قطرہ ہے بحرِ بیکرانہ !۱۱

اپنی معرکۃ الآرا تصنیف ''تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' (*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*) میں اقبال انسان کی لغزش کو بھی اس کے شعور کی آگہی سے تعبیر کرتے ہیں ، اور اس کی لغزش کا خوب صورت جواز پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں۱۲ :

"The Fall does not mean any moral depravity ; it is man's transition from simple consciousness to the first flash of self-consciousness, a kind of waking from the dream of nature with a throb of personal causality in one's own being."

[ہبوط آدم کا اشارہ کسی اخلاقی پستی کی طرف نہیں ، اس کا اشارہ اس تغیر کی طرف ہے جو شعور کی صاف و سادہ حالت میں شعورِ ذات کی اولین جھلک سے اس نے اپنے اندر محسوس کیا ۔ وہ خوابِ فطرت سے بیدار ہوا اور سمجھا کہ اس کی حیثیت خود بھی اپنی جگہ پر ایک سبب کی ہے ۔]

علامہ آگے چل کر۱۳ لکھتے ہیں کہ قرآن حکیم کے مطابق :

"Man's first act of disobedience was also his first act of free choice ; and that is why, according to the Quranic narration, Adam's first transgression was forgiven."

[اس کی پہلی نافرمانی وہ پہلا اختیاری عمل تھا جو اس نے اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے کیا اور یہی وجہ ہے کہ ارشادِ قرآنی کے مطابق آدم کا یہ گناہ معاف کر دیا گیا (۲ : ۳۷) ۔]

"That God has taken this risk shows His immense faith in man ; it is for man now to justify this faith."۱۴

۱۱- ''ضربِ کلیم'' ، ص ۸۶ ۔

۱۲- ص ۸۵ : اُردو ترجمہ سید نذیر نیازی : ''تشکیلِ جدیدِ الٰہیات اسلامی'' ، ص ۱۲۸ ۔

۱۳- ایضاً ۔

۱۴- ایضاً : اُردو ترجمہ ، ص ۱۲۹ ۔

[اگر مشیتِ ایزدی یوں ہی تھی کہ اس طرح کا خطرہ برداشت کر لیا جائے تو اس سے یہ حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ خدا کو اپنے بندوں پر کس قدر اعتماد ہے ۔]

اقبال نے متعدد اشعار میں آدمی کی فرشتوں پر برتری کا اظہار کیا ہے :

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن
ترا خدایہ فرشتے نہ کر سکے آباد !۱۵

فروغِ آدم خاکی ز تازہ کاری ہاست
مہ و ستارہ کنند آنچہ پیش از ایں کردند۱۶

"پیامِ مشرق" میں "تسخیرِ فطرت" کے عنوان سے اقبال نے جو خوب صورت نظم لکھی ہے اس کے ذیلی عنوان "میلادِ آدم" کے اشعار ملاحظہ ہوں :

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے ، خود شکنے ، خود نگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بیخبر از خویش بآغوشِ حیات
چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد۱۷

"بالِ جبریل" کی نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" اس سلسلے کی اہم کڑی ہے ۔ صرف دو اشعار پر اکتفا کرتا ہوں :

۱۵- "بالِ جبریل" ، ص ۱۰ - ۱۶- "زبورِ عجم" ، ص ۱۷۹ -
۱۷- "پیامِ مشرق" ، ص ۹۷ -

سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا خمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے :

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل ، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک ، یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ ، یہ صحرا ، یہ سمندر ، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے !
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے
ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے
تعمیرِ خودی کر اثرِ آہِ رسا دیکھ

اقبال نے انسان کو تخلیقِ کائنات میں خدا کا ہم عناں بنا کر ایک طرف نیابتِ الٰہی میں مرکزی کردار بخشا تو دوسری طرف اس کو ذوقِ لطیف بخش کر اس کا ہم قدم بنایا ۔ ''پیامِ مشرق'' میں ''محاورہ مابین خدا و انسان'' میں اقبال نے خدا اور انسان کے درمیان جو مکالمہ پیش کیا ہے ، وہ اس کی عظمت کو ہی واضح نہیں کرتا بلکہ وہ اپنے تخلیقی جوہر کی بنا پر خداوند تعالیٰ سے اپنی تعمیری قوت کا اعتراف کرانا چاہتا ہے اور جرأتِ رندانہ سے اللہ تعالیٰ کی شکایت کا برجستہ جواب دیتا ہے ۔ ملاحظہ ہوں یہ اشعار ۔

خداوند تعالیٰ کو شکایت ہے کہ :

جہاں را ز یک آب و گِل آفریدم — تو ایران و تاتار و زنگ آفریدی
من از خاک پولادِ ناب آفریدم — تو شمشیر و تیر و تفنگ آفریدی

تبر آفریدی نہال چمن را قفس ساختی طائر نغمہ زن را

انسان جواب دیتا ہے کہ :

تو شب آفریدی چراغ آفریدم سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

خداوند تعالیٰ نے دنیا پیدا کی اور انسان نے اس کو خوب تر بنایا :

نوائے عشق را ساز است آدم کشاید راز و خود راز است آدم
جہاں او آفرید ۔ ایں خوب تر ساخت مگر با ایزد انباز است آدم[۱۸]

اسی طرح "جاوید نامہ" میں خلافت آدم کے عنوان سے اقبال نے جو اشعار لکھے ہیں وہ نہ صرف انسانی عظمت و برتری کے مظہر ہیں بلکہ انسان کے اعلیٰ و افضل مقام کی آخری حد کی نشان دہی کرتے ہیں اور وہ روئے زمین پر نائب ایزدی ہے ۔

حرف انی جاعل تقدیر او
از زمیں تا آسمان تفسیر او
مرگ و قبر و حشر و نشر احوال اوست
نور و نار آن جہان اعمال اوست
او امام و او صلوٰت و او حرم
او مداد و او کتاب و او قلم !

* * *

از وجودش اعتبار ممکنات اعتدال او عیار ممکنات

"بانگ درا" کی نظم "انسان" کا آخری شعر انسان کی تخلیقی قوت کا عکاس ہے ۔ علامہ اقبال اس کی بے پناہ صلاحیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں :

۱۸- ایضاً ، ص ۱۶ ۔

چاہے تو بدل ڈالے ہیئت چمنستاں کی
یہ ہستیٔ دانا ہے ، بینا ہے توانا ہے

اور خدا خود ایسے مردِ کامل کی تلاش میں ہے :

ما از خدائے گم شدہ ایم ، اُو بجستجوست
چوں ما نیازمند و گرفتار آرزوست

اور ایسے انسان کو جب موت آتی ہے تو خود خدا بھی شرمسار ہو جاتا ہے ۔ علامہ اقبال کے نزدیک معراجِ مصطفوی انسانی عظمت کا منتہائے کمال ہے :

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں[۱۹]

زندگی خود را بخویش آراستن — بر وجودِ خود شہادت خواستن[۲۰]
بر مقامِ خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ دیدن زندگی است[۲۱]

از شعور است این کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور[۲۲]

معراج کے واقعے سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ تطہیرِ قلب و روحانی بالیدگی انسان کو کس بلندی تک پہنچا سکتی ہے :

رہِ یک گام ہے ہمت کے لیے عرشِ بریں
کہ رہی ہے یہ مسلماں سے معراج کی رات ![۲۳]
ناوک ہے مسلماں ! ہدف اس کا ہے ثریا !
ہے سرِ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج ![۲۴]

لیکن تن آسان ، بے عمل اور نفیِ ذات کرنے والوں کی مذمت بھی کرتے ہیں اور خدا کی ایسی مخلوق پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

۱۹- ''بالِ جبریل'' ، ص ۴۴ - ۲۰- ''جاوید نامہ'' ، ص ۱۳ -
۲۱- ایضاً ، ص ۱۴ - ۲۲- ایضاً ، ص ۲۰ -
۲۳- ''بانگِ درا'' ، ص ۲۸۱ - ۲۴- ''ضربِ کلیم'' ، ص ۹ -

یہی آدم ہے سلطاں بحر و بر کا ؟
کہوں کیا ماجرا اس بےبصر کا !
نہ خود بیں نے خدا بیں نے جہاں بیں !
یہی شہ کار ہے تیرے ہنر کا ؟[۲۵]

اور ایسے بے ہنر انسانوں کو وہ للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ :

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام[۲۶]

بآدمے نرسیدی ، خدا چہ می جوئی
ز خود گریختہ، آشنا چہ می جوئی ![۲۷]

اقبال کے عظمتِ انسانی کے اسی تصوّر نے ان کے کلام کو آفاقیت بخشی اور وہ دانائے راز ، علم بردارِ انسانیت اور اخوّت کا نقیب بن کر شہرتِ دوام حاصل کرتے ہیں :

بہرِ انسان چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست[۲۸]

انفرادی طور پر ایک فرد کی خودی اور اجتماعی طور پر قومی خودی کی تلقین کو اگر بہ نظرِ غائر دیکھیں تو عظمتِ انسانی کا یہ بھی ایک پہلو ہے اور رنگ و نسل ، زبان اور علاقے کے امتیاز کو ختم کر کے ملت میں گم ہو جانے کا تصوّر بھی اسی عظمتِ انسانی کا ایک رخ ہے ۔ ''اسرارِخودی'' میں ''ہمالہ اور گنگا کے مابین ایک مکالمہ'' ہے جس میں سید علی ہجویری داتا گنج بخشؒ نے ایک غیر مسلم نوجوان کو نصیحت کی ہے جس میں تمام مذاہب کی عزت کرنے کی تلقین کی ہے ۔ یہ اسلام کے ''لا اکراہ فی الدین'' کے بنیادی اصول پر مبنی ہے :

گر ز جمعیت حیاتِ ملت است
کفر ہم سرمایۂ جمعیت است[۲۹]

۲۵- ''بالِ جبریل'' ، ص ۳۲ ۔
۲۶- ''ضربِ کلیم'' ، ص ۱۶ ۔ ۲۷- ''جاوید نامہ'' ، ص ۲۲۰ ۔
۲۸- ''اسرار و رموز'' ، ص ۱۰ ۔ ۲۹- ایضاً ، ص ۶۶ ۔

من نگویم از بتاں بیزار شو
کافری ؟ شائستہ زنّار شو[۳۰]

اسی طرح سے وہ نپولین اور مسولینی کی ان کی جرأت اور عظیم شخصیتوں کی بنا پر تعریف کرتے ہیں ۔ ''جاوید نامہ'' میں وہ وشوامتر ، بھرتری ہری ، ٹالسٹائی ، قراۃ العین ، کارل مارکس ، نطشے ، زرتشت ، گوتم بدھ وغیرہ کا ذکر کر کے اپنی انسانی دوستی اور ایک دوسرے کے لیے محبت اور رواداری کا اظہار کرتے ہیں ۔ ''جاوید نامہ'' کے آخری باب میں نئی نسل کو جو تلقین کی ہے وہاں بھی اسی پر زور دیا گیا ہے کہ ذات پات اور مذاہب کے امتیاز کے بغیر تمام بنی نوع انسان کو عزت اور احترام کی نظر سے دیکھنا چاہیے اور یہی اسلام کی تعلیم ہے :

بندۂ عشق از خدا گیر و طریق
می شود بر کافر و مومن شفیق !
گرچہ دل زندانیٔ آب و گل است
ایں ہمہ آفاق آفاقِ دل است[۳۱]

اسی طرح اقبال نے عظمتِ انسانی کے درس کے ساتھ اپنی وسیع النظری اور عالم گیر جذبۂ اخوت کا اظہار کیا ہے ۔ E. M. Foster نے اپنی کتاب *Two Cheers for Democracy* میں اقبال کی اسی انسان دوستی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

"Whatever his opinions, he was no fanatic, and he refers to Hindus and Christians with courtesy and respect."

علامہ اقبال آپس میں جنگ و جدال کرنے والی قوموں کے درمیان مفاہمت کے لیے برابر کوشاں رہے :

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیتِ اقوام کہ جمعیتِ آدم ![۳۲]

۳۰۔ ایضاً ۔ ۳۱۔ ''جاوید نامہ'' ، ص ۲۴۲ ۔
۳۲۔ ''ضربِ کلیم'' ، ص ۵۵ ۔

اسی طرح اقبال کی شاعری اور اقبال کے فکر و فلسفہ کا ایک اہم موضوع انسان کی کھوئی ہوئی عظمت کی بازیافت ہے جس کے متعلق قرآن میں کہا گیا ہے کہ ''یقیناً ہم نے انسان کو عزت اور توقیر بخشی ہے۔''

ایسا معاشرہ جس میں رنگ و نسل کا امتیاز ہو وہ انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ ہے۔ وہ ایک ایسے سماج اور ایسے نظام کی تلاش میں ہیں جہاں عزتِ نفس ہو، جہاں محنت کی قدر ہو، انسانی عظمت کا احساس ہو، عوام کا معیارِ زندگی بلند ہو، تعصب اور نسلی امتیاز کا خاتمہ ہو۔ اسی لیے وہ اسلام کی اعلیٰ اخلاق اور روحانی قدروں پر زور دیتے ہیں کیونکہ انسانی فضیلت کا انحصار نسب و دولت پر نہیں بلکہ پاکیزہ انفرادی زندگی اور عدل و انصاف پر مبنی اجتماعی شعور پر ہے۔ دراصل احترامِ آدمی کا یہی مفہوم ہے:

آدمیت احترامِ آدمی با خبر شو از مقامِ آدمی[۳۳]

۳۳۔ ''ارمغانِ حجاز''، ص ۱۴۹۔